عبدالقاہر جرجانی کا تنقیدی نظریہ

از جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم، اے (علیگ)

عبدالقاہر جرجانی عربی تنقید میں ایک ممتاز طرزِ فکر کے حامل ہیں، انھوں نے گذشتہ ناقدوں کی تقلید نہیں کی اور اپنے مطالعہ سے فکر کی نئی راہیں تلاش کیں۔ پانچویں صدی ہجری میں اگر عبدالقاہر اپنے قیمتی نظریات سے ادبی تنقید کو زندگی نہ بخشتے تو وہ جمود کا شکار ہوجاتی جیسا کہ ان کے بعد ہوا۔ عربی تنقید کے ارتقاء کا اصل زمانہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ تنقید کا آغاز ابن سلام سے ہوتا ہے۔ اور عبدالقاہر جرجانی پر وہ ختم ہوجاتی ہے۔ ان کے بعد ناقدوں کی حیثیت محض مدوّن اور شارح کی رہ جاتی ہے۔

جرجانی نے دو بہت اہم کتابیں ادبی تنقید پر لکھیں۔ ایک "اسرار البلاغہ" اور دوسری "دلائل الاعجاز" دونوں کتابوں میں مصنف کا رنگ ایک ہے اور ایک ہی نظریہ پر دونوں کتابیں مبنی ہیں۔ اس طرز سے کسی عرب ناقد نے نہیں لکھا تھا۔ جرجانی کے فکر کا محور صرف ایک ہے وہ یہ کہ کلام یا شعر میں حُسن کا مرجع کیا ہے؟ کس وجہ سے انسان زبان و بیان اور شعر و ادب میں کشش محسوس کرتا ہے؟ یہ بات دوسرے الفاظ میں یوں نہیں کہی جاسکتی ہے کہ کلام میں الفاظ کو ترجیح حاصل ہے یا معانی کو، حسن کا مرجع الفاظ ہیں یا معانی؟ یہ ایک بحث تھی جو صدیوں عرب ناقدوں کے درمیان باعثِ اختلاف رہی۔ سب سے پہلے اس مسئلہ کو جاحظ نے اٹھایا مگر انھوں نے الفاظ کو ترجیح دی اور بتایا کہ معانی کو سبھی جانتے ہیں اصل حُسن و کشش اُس قالب میں ہے جس میں معنی کو پیش کیا جائے۔ یہ تصور عربوں میں بہت مقبول ہوا اور سوائے قُدامہ بن جعفر کے باقی تمام ناقدوں نے اس نظریہ کو تسلیم کیا۔

عبدالقاہر جرجانی نے اس نظریہ کی پُرزور تردید کی، انھوں نے کہا کہ کلام میں حسن کا مرجع دراصل معانی ہیں۔ الفاظ نہیں۔ انھوں نے تمام تنقیدی خیالات پر بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عبارت کا سارا حسن اس کے معانی میں پوشیدہ ہوتا ہے، چنانچہ تشبیہ، استعارہ اور تمثیل پر تفصیلی بحث کی اور ان کو دو دو قسموں میں تقسیم کیا، مفید اور غیر مفید، اسی طرح بیان و بدیع کی تمام اقسام کی بھی دو دو قسمیں کیں، عقلی اور تخیلی، اور ان سے یہی ثبوت پیش کیا کہ جہاں معانی ہوتے ہیں، وہیں حسن و کشش بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں معانی محور ہیں جن کے گرد تمام اقسامِ کلام چکر لگاتے ہیں۔[1]

یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ وہ الفاظ کو تو مرجعِ حسن نہیں تصور کرتے مگر معانی کو بھی اصل کشش کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ "اسلوب" کو مرکزِ حسن قرار دیتے ہیں، شعر و ادب کا سارا جمال ان کے خیال میں مرہونِ منت ہے۔ اسلوب اور معانی کے نظم کا۔ معانی جتنی خوبصورتی سے ایک دوسرے سے مربوط اور منظم ہوں گے۔ اسلوب کا حسن اتنا ہی واضح ہوگا۔[2]

عبدالقاہر جرجانی نے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور خاص طور سے وہ ارسطو کے خیالات سے متاثر ہوئے چنانچہ تشبیہ، استعارہ اور مجاز کی ساری بحثیں اس تاثر کو نمایاں کرتی ہیں، اس کے علاوہ مجاز کی بحث میں انھوں نے اس کی ایک نئی قسم بتائی ہے جس کا نام وہ "مجازِ مرسل" رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین رقمطراز ہیں کہ یہ قسم انھوں نے یونانی فکر سے حاصل کی ہے۔[3] جرجانی کی فلسفیانہ تقسیمیں بھی ان کے اس تاثر کا پتہ دیتی ہیں۔

جرجانی کی عظمت کا ایک پہلو اور ہے وہ یہ کہ انھوں نے کلام کا مطالعہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے کیا۔ اس سے قبل کسی ناقد نے اس نقطۂ نظر سے عربی تنقید کو آشنا نہیں کیا تھا۔ جرجانی نے بڑی دقتِ نظر سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ نفسِ انسانی پر الفاظ، معانی اور ان کی مرکب شکلوں سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، نیز تشبیہ، استعارہ، امثال، اشارہ اور زبان کی بے شمار خوبیوں کا انسان کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے، اس حیثیت سے ان کو عظمت اور سبقت کا شرف حاصل ہے جس سے پوری عربی تنقید خالی تھی۔ ڈاکٹر بدوی طبانہ نے ان کی اس حیثیت پر

---

[1] اسرار البلاغۃ۔ تالیف عبدالقاہر جرجانی ص ۳۳۔ [2] نقد النثر۔ تالیف قدامہ بن جعفر۔ مطبوعہ دارالکتب المصریہ۔ ملاحظہ ہو مقدمہ از ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ [3] ایضاً۔

بڑی اچھی طرح روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میں نے کوئی عرب ناقد ایسا نہیں پایا جس نے فنِ کلام کو اس طرح نفسیات یا علمِ نفس کے سامنے جھکا دیا ہو۔ جرجانی کا مطالعہ اس حیثیت سے ایک بالکل نئی چیز ہے۔ دوسرے ناقدوں نے اس پہلو کو بالکل چھوڑ رکھا تھا۔[1] مگر عبدالقاہر نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے تعرض کرکے اس خلاء کو پُر کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سے قبل کسی نے اس انداز کی بحثیں نہیں کی تھیں، چھوٹے چھوٹے لفظ کی تاثیر پر کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایک معمولی سی تبدیلی میں انسان پر کلام کے اثر میں کتنا فرق رونما ہو جاتا ہے اور الفاظ کی تنقید کرتے وقت اس طرز کی تبدیلیوں کی کیا اہمیت ہے۔

جرجانی کے نفسیاتی مطالعہ سے ایک اور فائدہ ان کو غیر شعوری طور پر پہونچ گیا، انھوں نے یہ معلوم کرنیکی کوشش کی کہ مبتدأ اور خبر کو مقدم و مؤخر کرنے سے کیا فوائد ہوتے ہیں، الگ الگ الفاظ کے انسانی قلب پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں جب سکاکی نے علمِ بدیع، علمِ بیان اور علمِ معانی کی تقسیمیں کیں تو معلوم ہوا کہ عبدالقاہر جرجانی دراصل علمِ معانی کے مؤسسین میں سے ہیں۔

جرجانی کہتے ہیں کہ الفاظ کے لئے مواقع ہوتے ہیں، ایک موقع پر ایک لفظ مناسب ہوتا ہے اور دوسرے موقع پر وہی لفظ ناپسندیدہ ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں وہ عربی شاعری سے مثالیں پیش کرکے بتاتے ہیں کہ کس طرح ایک شاعر نے ایک لفظ کو مناسب موقع پر استعمال کیا جس سے شعر میں جان پڑ گئی مگر اُسی لفظ کو ایک دوسرے شاعر نے اس طرح استعمال کیا کہ شعر کا سارا حُسن ختم ہو گیا۔[2]

جرجانی کا خیال تھا کہ شعر کی خصوصیات اور حسن کو معلوم کرنے کے لئے سب سے ضروری عنصر ذوقِ لطیف ہے، علم اور ذوق یہی ناقد کا سارا سرمایہ ہیں اُسی کے ذریعہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کرتا ہے اور اسی سے وہ حسن و قبح کا معیار بھی قائم کرتا ہے۔[3]

جرجانی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مسجع کلام بہت حسین ہوتا ہے اور کوئی اچھا کلام مسجّع ایسا نہیں ہو سکتا جس کے معانی خراب ہوں، ان کا مطلب یہ ہے کہ سجع اور مزعِ حسن معانی ہیں الفاظ نہیں۔[4]

---

[1] البیان العربی، تالیف ڈاکٹر بدوی طبانہ۔ ص ۱۵۱۔ [2] دلائل الاعجاز۔ تالیف جرجانی ج ۱ ص ۴۴، ۴۵۔

[3] دلائل الاعجاز۔ ج ۲ ص ۴۷، ۱۹۲۔ [4] اسرار البلاغۃ۔ " " ص ۱۵۔

اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ سجع کی طرف توجہ ادیب کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی بلکہ بہتر یہ ہے کہ آدمی کلام کو اس کی فطرت پر چھوڑ دے اور کسی چیز کا اس سلسلہ میں التزام نہ کرے اس لئے کہ التزام سے تکلف پیدا ہوتا ہے' وہ کہتے ہیں کہ قدیم عرب ادبا بھی سجع استعمال نہیں کرتے تھے مگر پھر بھی ان کے کلام میں سلاست ہے اور وہ اپنے مقاصد کو اپنی عبارت میں بخوبی واضح کر دیتے ہیں، پھر وہ مزید کہتے ہیں کہ بسا اوقات یہ صنائع و بدائع کلام کو ثقیل کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح ہو جاتا ہے جیسے کسی عورت کو بہت سے زیور پہنا دیئے جائیں جس سے وہ خود اذیت محسوس کرے، اگر کسی کو صنائع و بدائع کے استعمال کا شوق ہو تو اتنی دِقّتِ نظر پیدا کرے کہ اس کے صحیح استعمال پر قادر ہو سکے [1]

تجنیس کے سلسلہ میں بھی وہ کہتے ہیں کہ التزام اچھا نہیں۔ تجنیس بہترین اس وقت ہوتی ہے جبکہ دو لفظوں کے معانی بھی عقلاً یکساں ہوں - اگر محض لفظ کی مناسبت درکار ہو تو وہ تجنیس ان کے نزدیک قبیح ہے۔ معانی کی یکسانیت اس سلسلہ میں اصل اہمیت کی مستحق ہے [2]

کنایہ کی بحث میں ان کا یہ نظریہ ہے کہ وہ اس کو کھُل کر واضح طور پر بات کہنے سے زیادہ بلیغ سمجھتے ہیں، مثلاً اگر آپ کہیں کہ "میں ایک قدم آگے بڑھاتا ہوں اور دوسرا پیچھے ہٹاتا ہوں" یہ اظہار زیادہ بلیغ ہے اس سے کہ آپ کہیں کہ میں متردد ہوں، کنایہ کی صورت میں بات زیادہ بلیغ اور مؤثر انداز میں کہی جاتی ہے اس لئے اس کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے [3]

جرجانی "حشو" کے بیان میں فائدہ کو اہمیت دیتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ اگر اُس سے کوئی فائدہ ہو تو پھر اس کو حشو نہیں کہا جائے گا۔

عبدالقاہر جرجانی کلام کی دو قسمیں کرتے ہیں یعنی مطبوع اور مصنوع (طبعی اور پُرتکلف) فطری کلام کی رونق ہمیشہ باقی رہتی ہے مگر تکلف و آورد سے پُر کلام وقتی ہوتا ہے۔ فطری کلام کی مثال سونے کی سی ہے کہ اگر اس سے کوئی چیز تیار کی جائے تو وہ قابلِ قدر ہے لیکن اگر اس پر کچھ نقش و نگار بھی ہوں تو وہ اور بھی زیادہ پُرکشش ہو جائے گی اور اس کا حُسن زائل نہیں ہوگا۔ غیر فطری کلام کی مثال اس طرح ہے جیسے کہ مٹی لے کر اس کی کوئی خوبصورت چیز تیار کی جائے جب تک اس پر رنگ و روغن ہے اور نقش و نگار ہیں وہ لوگوں کے لئے

---

[1] اسرار البلاغۃ ص ۱۳، ۱۴۔ [2] ایضاً ۱۱-۱۲۔ [3] دلائل الاعجاز ج ۱ ص ۴۵۔

باعثِ کشش ہے مگر جوں ہی نقوش مٹے اور رنگ اڑا پھر وہ مٹی ہے جس کی کوئی قدر نہیں[۱]

جرجانی نے تعقید کی بڑی برائی کی ہے اس لئے کہ قاری اس کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے اس میں الفاظ کی صحیح ترتیب قائم نہیں رہتی جس کی وجہ سے الفاظ اور معانی کی مطابقت میں فرق آجاتا ہے۔ نتیجۃً مفہوم سمجھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے اور جب بہ مشکل معانی سمجھ میں بھی آتے ہیں تو وہ ایسی بگڑی ہوئی شکل میں کہ کلام کی تاثیر اور اس کا فائدہ غائب ہو جاتا ہے[۲]

جرجانی ایک نہایت اہم مسئلہ پر بڑی دقتِ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں وہ ہے سرقہ کا مسئلہ، ادبی سرقہ عربی تنقید کے بہت اہم مسائل میں سے ہے شروع میں تو عرب ناقدوں کو جہاں قدماء کا کوئی شعر ایسا مل گیا جس سے "محدثین" کے شعر میں یکسانیت ہو فوراً انھوں نے سرقہ کا الزام لگا دیا مگر بعد میں یہ طے ہوا کہ معانی مشترک ہوتے ہیں، لہٰذا سرقہ ممکن نہیں اس لئے کہ جتنے معانی تھے سب کو قدماء نے استعمال کر لیا اور نئے شعراء کے لئے کچھ باقی نہیں چھوڑا لہٰذا وہ سرقہ پر مجبور ہیں۔

جرجانی نے یہ تخیل پیش کیا کہ کسی شاعر نے کوئی خیال پیش کیا اس کو کسی اچھی شکل سے لے لینا سرقہ نہیں ہے اگر کسی نے اپنی ذہنی صلاحیت، فکر و کاوش اور ذاتی سعی سے کوئی نیا خیال پیش کیا تو اس کو لے لینا چوری ہے جو مذہبِ شاعری میں جائز نہیں[۳] اس سے جرجانی نے عام ناقدوں کے اس جامد نظریہ پر ضرب کاری لگائی کہ معانی میں اضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہی لہٰذا سرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے بتایا کہ انسان نئے معانی اپنے ذہن و فکر سے پیدا کر سکتا ہے، امکان کی دنیا وسیع تر ہے۔ جرجانی نے پھر اپنے اصل نظریہ کی تائید بھی کی اور کہا کہ یہ چوری الفاظ میں بھی ممکن ہے اور معانی میں بھی سرقہ ہوتا ہے۔ اس پر وہ بھی اتفاق کرتے ہیں کہ بہت سے معانی مشترک ہیں ان میں سرقہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا مثلاً کسی نے کسی کو سخاوت میں دریا سے تشبیہ دی تو اس میں سرقہ نہیں ہوتا کیوں کہ یہ معروف حقائق ہیں جن کو کوئی کسی سے چراتا نہیں۔

جرجانی صدق و کذب کے مسئلہ سے بھی تعرض کرتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ جس شعر میں جھوٹ ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے اور جس میں سچ ہو وہ بھی قابلِ تعریف ہے لیکن آخر میں وہ ترجیح مبالغہ کو دیتے ہیں ان کے خیال میں مبالغہ سے وصف اور مدح میں خاص طور سے شاعر کے امکان کی دنیا بہت وسیع ہو جاتی ہے۔ صدق شاعری میں

۱؎ اسرار البلاغۃ ص ۳۲ - ۲؎ ایضاً ص ۱۶۲، ۱۶۳ - ۳؎ ایضاً ص از ۳۸۲ تا ۳۸۷ -

ان کے نزدیک ایک خوبصورت عقیم عورت کی طرح ہے لیکن مبالغہ ادیب و شاعر کو ایک وسعتِ بے پایاں عطا کرتا ہے۔[1]

جرجانی ایک جگہ بڑی ہی فکر انگیز بات کہتے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ ادیب اور شاعر کا اسلوب اس کی فکر کا ایک جزو ہے، شاعر جو کچھ کہتا ہے اور جس انداز میں کہتا ہے وہ اس کے فکری عمل کا نمونہ ہوتا ہے وہ اپنے اندرون کی ترجمانی کرتا ہے سب سے پہلے فکر اپنے عمل سے شاعر کو متاثر کرتی ہے جب وہ اپنا عمل پورا کر لیتی ہے تو اسی کو شاعر الفاظ کے قالب میں پیش کرتا ہے۔[2]

عبدالقاہر نے ابوتمام پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ان کے یہاں الفاظ سخت ہیں، ترکیب پیچیدہ ہے، مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، اس کے مقابلہ میں وہ بحتری کی تعریف کرتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ کوئی اتنے دقیق و اعلیٰ مضامین کو اتنی صاف، آسان، اور سلیس زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جس طرح کہ بحتری کو اس پر قدرت حاصل ہے وہ اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ بعض اشعار بحتری کے بھی ایسے ہیں جو سمجھنے میں کد و کاوش چاہتے ہیں۔[3]

عبدالقاہر کا یہ خیال صحیح نہیں ہے جبکہ ابوتمام جس بلندی تک پہونچتا ہے، بحتری اس کے قریب بھی نہیں جا پاتے، ابوتمام کی شاعری میر کے طرز کی ہے کہ "بلندش بسیار بلند و پستش بسیار پست"

جرجانی کی نظر میں ایک کلام دوسرے سے افضل محض معانی کی خوبی کی وجہ سے ہوتا ہے اس میں الفاظ کو دخل نہیں ہوتا۔ ایک شعر کے معانی میں کوئی ایسی خوبی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے شعر سے زیادہ پُرکشش ہو جاتا ہے۔[4] وہ ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں کہ جب کوئی صاحبِ نظر کسی کلام یا شعر کی تعریف کرتا ہے تو لفظ کی تعریف کہتا ہے کہ کتنے شیریں، پُرکشش اور پُرشوکت الفاظ ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ان الفاظ کی تعریف کر رہا ہے جو اس شعر یا کلام میں استعمال ہوئے ہیں وہ یہ نہیں بتانا چاہتا کہ ان الفاظ کے ترنم کی کیفیت یا ان حروف کے تلفظ میں کوئی کشش ہے یا ظاہری ترکیب میں کوئی حسن ہے بلکہ وہ اُس کیفیت کا اس طرح اظہار کرتا ہے جو وہ اپنے قلب میں محسوس کر رہا ہے اور جس کے اثرات اس کی عقل پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ دراصل تعریف معانی ہی کی کرتا ہے۔

---

[1] اسرار البلاغۃ۔ ص از ۳۰۶ تا ۳۰۹۔ [2] ایضاً ص، ۴۰-۴۱۔

[3] " " ص ۱۶۳، ۱۶۷، ۱۶۸۔ [4] دلائل الاعجاز ج ۲ ص ۲۶۔